بین الاقوامی شہید اعظم حسین ابن علی علیہما السلام

آیۃ اللہ العظمیٰ سید العلماء سید علی نقی نقوی طاب ثراہ

اس مضمون کو محرم ۱۳۷۹ھ/۱۹۵۹ء میں امامیہ مشن نے اپنے سلسلہ اشاعت (نمبر ۱۷۰) میں تیسرے ایڈیشن کے طور سے شائع کیا تھا۔ اس کا پہلا ایڈیشن اس سے 'دو تین سال' قبل اشاعت پذیر ہوا تھا۔ عین ممکن ہے کہ امامیہ مشن کے ایڈیشن سے قبل یہ مضمون کسی رسالہ وغیرہ میں شائع ہو چکا ہو۔

آج جبکہ کانوں میں فرقہ وارانہ نعروں کی آواز گونجی ہوئی ہے، آنکھیں فرقہ پرستی کے مناظر دیکھنے کی عادی ہو چکی ہیں اور دل و دماغ فرقہ بندی کے تخیلات سے پر ہیں، یہ کہنا کہ حسینؑ کی ذات فرقہ بندیوں سے بالاتر ہے بظاہر غلط معلوم ہوگا۔ جبکہ یہ ظاہر ہے کہ حسینؑ کی ذات کا تعلق ایک خاص فرقہ سے ہے۔ بیشک حسینؑ کا تعلق ایک خاص فرقہ سے ہے، بہ ایں معنی کہ حسینؑ اسلام کے پیرو تھے۔ بیشک حسینؑ کا تعلق ایک ہی فرقہ سے ہے بایں معنی کہ حسینؑ مسلمانوں میں پیدا ہوئے اور بیشک حسینؑ کا تعلق ایک ہی فرقہ سے ہے بایں معنی کہ حسینؑ پیغمبر اسلامؐ کے نواسے تھے لیکن جس طرح کوئی دریا باوجودیکہ کسی ایک ہی حصہ زمین سے نکلا ہوگا مگر جہاں جہاں تک پہنچتا ہے ہر قوم کو فیضیاب کرتا ہے، جس طرح سورج مشرق سے نکلنے کے باوجود مغربی حصوں کو بھی اپنی ضوفشانیوں سے منور کر دیتا ہے، جس طرح بادلوں کا ایک سمت سے اٹھنا دوسری طرف کی خشک زمین کو سیراب کرنے سے نہیں روکتا، اسی طرح حسینؑ کی شخصیت کا عرب قوم میں اور اسلام کے مذہب میں پیدا ہونا ان کو بلحاظ افادیت کسی ایک فرقہ تک محدود نہیں رکھ سکتا۔ بالکل اسی طرح جیسے ان کا بنی ہاشم کے خاندان میں ہونا عرب ملک اور قوم کے دوسرے خاندانوں کو ان سے بیگانہ قرار دینے کا باعث نہیں ہوسکتا۔

دنیا میں مختلف مذاہب ہیں، لیکن باوجود تمام اختلافات کے کچھ اچھائیاں ایسی ہیں جن کو متفقہ طور پر تمام مذاہب اچھائیاں سمجھتے ہیں اور بہت سی برائیاں ہیں جو سب کے نزدیک برائیاں ہیں، یہاں تک کہ برے آدمی بھی برائیاں کرتے ہیں تو اچھائی کے نام کے ساتھ، ہر جھوٹ سچ کے نام سے بولا جاتا ہے۔ ہر بے ایمانی دیانت داری کے نام سے کی جاتی ہے اور یہ برائی کو اچھائی کہہ کے کرنا ہی اس کا ثبوت ہے کہ برا آدمی بھی اپنے اس عمل کو برا سمجھتا ہے۔ اس لئے میرا خیال ہے کہ اگر دنیا میں ایک بین الاقوامی ادارہ ایسا قائم کیا جائے جس میں تمام مذاہب کے ذمہ دار افراد شامل ہوں اور اس کا مقصد نوع انسانی میں ان اچھائیوں کی تبلیغ ہو جن کے اچھے ہونے پر سب متفق ہیں اور ان برائیوں سے روکنا ہو جن کی برائی سب کے نزدیک متفق علیہ ہے تو یہ ایک بڑی انسانی خدمت قرار پائے گی اور اگر دنیا عملی طور پر اس پر کاربند ہو جائے تو باوجود اختلاف مذہب و ملت کے یہ دنیا سب کے لئے اس دور حیات میں ایک جنت بن سکتی ہے۔

جس طرح عمدہ اخلاقی اصول کسی ایک فرقہ سے مخصوص نہیں ہیں، اسی طرح کسی ایسے بلند اصول کی تعلیم دینے والے کی ذات ایک ہی فرقہ سے وابستہ نہیں ہوسکتی۔ امام حسینؑ نے ایک ایسا اسوۂ حسنہ ہمارے سامنے رکھ دیا ہے جو یکساں طور پر ہر فرقہ

کے لیے مشعل راہ بن سکتا ہے اور وہ ہے حسینؑ ابن علیؑ کا وہ جہاد جو انہوں نے خود اپنی قوم کی خرابیوں کو دور کرنے کے لئے کیا، حسینؑ کی ذات فرقہ بندیوں سے بالاتر نہ ہوتی۔ اس وقت جب کہ وہ کسی دوسرے فرقہ کے خلاف جہاد کرتے اور نتیجتاً مخالف فرقہ کے افراد امام حسینؑ کے مخالف ہوجاتے لیکن امام حسینؑ نے جو جہاد کیا وہ اپنے ہی مذہب (اسلام) والوں کے ان افراد کے خلاف تھا جو اچھائیوں کے اصول سے ہٹ کر برائیوں کے پیرو ہو گئے تھے۔

موجودہ خلفشار اور ہنگامہ آرائیوں میں ہمارا اور آپ سب کا مشاہدہ ہے کہ ننانوے فیصدی لوگوں کا رجحان طبع اس طرف ہے کہ دوسری قوم کی خرابیوں کو مبالغہ کے ساتھ بیان کیا جائے اور اپنی قوم کے مظالم کی پردہ پوشی کی جائے۔ یہاں تک کہ جو بڑے افراد اپنی قوم کی زیادتیوں کا ذکر کرتے ہیں انہیں بھی دو طریقوں سے ہلکا کرنے کی کوشش ضرور کرتے ہیں۔ ایک یہ کہ ہماری قوم نے جو مظالم کئے وہ دوسروں کے مقابلہ میں کم ہیں، دوسرے یہ کہ پہل دوسروں نے کی تھی۔ ادھر سے جو کچھ ہوا۔ وہ جواب میں ہوا پھر لیڈروں کی یہ کوشش تو ظاہر ہے کہ عوام اس کے معنی کیا سمجھ سکتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہر قوم کے افراد یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ جو کچھ انہوں نے کیا وہ اگر چہ برا ہوتا مگر اس لئے اب برا نہیں کہ جوابی طور پر کیا گیا یا یہ کہ جو کچھ کیا دوسرے فریق کی برائیوں سے وہ کم ہے، اس لئے اسے قابل اعتراض نہیں سمجھنا چاہیے۔ اس ذہنیت کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ عام افراد تو ازن برابر کرنے کے لئے اور زیادہ تشدد اور بربریت کا ثبوت دیتے ہیں۔ اس کے بعد منتقمانہ کاروائیاں دوسری طرف سے شروع ہوجاتی ہیں اس طرح قتل و غارت گری کا لامتناہی سلسلہ قائم ہوجاتا ہے۔

امام حسینؑ کی عملی تعلیم یہ ہے کہ تم غیروں کے عیوب دیکھنے کے بجائے خود اپنی جماعت کے نقائص پر توجہ کرو۔ اور ان ہی کو سب سے زیادہ اہمیت دو۔ حقیقی رہنما کا یہ فرض ہے کہ وہ عوام کو ان کی غلطیوں پر سختی سے متنبہ کرے اور دوسرے فرقہ کی بداعمالیوں کے تذکرے کو خفیف سمجھ کر ان کو اتنی اہمیت نہ دے تا کہ لوگوں کی نظر اپنی غلطیوں پر پڑے اور اپنی اصلاح کی طرف متوجہ ہوں۔ کتنے غضب کی بات ہے کہ مذہب کے پرستار ایک ایک دوسرے کا برائیوں میں مقابلہ کرتے ہیں یعنی دوسرا برائی میں بڑھا نہ رہنے پائے۔ ہماری طرف سے کمی ہوئی ہے تو ہم اس کو پورا کردیں، حالانکہ اگر مذہب کی روح دماغوں میں راسخ ہوتی تو اچھائیوں میں مقابلہ ہونا چاہیے تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ عوام مذہب کو بحیثیت ایک برحق اصول کے مانتے ہی نہیں، بلکہ وہ اس لئے مانتے ہیں کہ وہ اس مذہب کے ماننے والے کے گھر میں پیدا ہوئے، اس لئے دل سے لا مذہب ہیں۔

اپنے مذہب سے ان کو اس طرح کی محبت ہے جیسے اپنے وطن سے، اپنی اولاد سے، اپنے گھر سے اور اپنے کسی دوست سے، یہ اپنے ہونے کی بنا پر جو محبت ہوتی ہے وہ درحقیقت اپنی ذات کی محبت ہوا کرتی ہے، بس اس طرح سے ان کو اپنے مذہب کی محبت ہے۔ اس لئے ان کی مذہبی جنگ بھی درحقیقت ایک ذاتی لڑائی ہے جیسے زر، زمین، زن کے اوپر لڑائیاں ہوا کرتی ہیں لیکن تصادم کی بنیاد تو یہ ہوتی ہے، کہ ہر دوسرے کو اس حق سے کچھ کم ہی دینا چاہتا ہے۔ لہٰذا کش مکش فساد اور خونریزی کی صورتیں پیدا ہوتی ہیں۔ مصلحین کا فرض ہے کہ وہ اپنی قوم کی بے راہ روی اور گمراہی کے خلاف علم جہاد بلند کریں۔ چاہے اس راستے میں ان کی جان بھی کام آئے، جسے انتہائی بلندی کی منزل پر امام حسینؑ نے اپنے عمل سے پیش کیا۔

مذہب نے جو اصول بتلایا ہے وہ یہ ہے کہ ہر ایک کو دوسرے کے مقابلے میں بلندی حاصل کرنا ہو تو اپنے حقیقی عمل کو اس سے بلند رکھے۔ اس طرح اگر مقابلہ بھی دو فریق میں ہونا چاہئے تو اس بات کا کہ دیکھیں کون دوسرے کے ساتھ احسان زیادہ کرتا ہے۔ اس کے نتیجہ میں کبھی تصادم نہیں ہوسکتا۔ اسلام نے جو تعلیم دی ہے اس کی ایک معمولی چیز پیش کرتا ہوں۔ تجارت

میں ترازو سے تولنے والی چیزوں کے متعلق حکم ہے کہ اگر تم خود تول کر بیچ رہے ہو تو کچھ زیادہ دینے کی کوشش کرو۔ اور اگر تم خریدنے جاؤ اور دوکاندار تم سے تولنے کے لئے کہہ دے تو کچھ کم ہی لینے کی کوشش کرو۔ اس کے بعد کیا مول تول میں کوئی جھگڑا ہو سکتا ہے؟ اب اگر دو قوموں کے درمیان کوئی معاملہ ہوا اور وہ اسی نظریہ کے ماتحت زمین کی تقسیم کریں چاہے دوسری طرف زیادہ زمین چلی جائے مگر دوسری قوم کی حق تلفی نہ ہو تو پھر تصادم کیونکر ممکن ہوسکتا ہے؟

یزید نے حسینؑ سے بیعت چاہی اور حسینؑ نے انکار کیا۔ حسینؑ کو بیعت سے اتنا انکار کیوں تھا؟ اس کا جواب اسی سے ملے گا کہ آخر یزید کو بیعت کے لئے اتنا اصرار کیوں تھا؟ بس جس لئے اسے اتنا اصرار تھا، اسی لئے حسینؑ کو انکار تھا۔ یزید کا اصرار بیعت پر اس لئے تھا کہ وہ سمجھتا تھا کہ اس نے اسلامی قوانین کی کھلی ہوئی خلاف ورزی کی ہے۔ اس نے تو اتنے موٹے موٹے اصولوں کی خلاف ورزی کی تھی جس کی بنا پر خود اسے یقین تھا کہ ادھر لوگوں کے دماغوں سے رشوت کا نشہ ذرا بھی کم ہوا، اُدھر چمکتی ہوئی تلواروں کی چمک نظر سے ذرا اوجھل ہوئی اور ہر موٹی نظر کا مسلمان بھی محض ایک نگاہِ غلط انداز سے یہ سمجھ لے گا کہ یزید خلیفۂ برحق نہیں ہوسکتا۔ ضرورت تھی کہ اپنے خلیفۂ برحق ہونے کے جواز میں شریعت اسلامی کے حقیقی پاسباں سے سند لے لی جائے تاکہ جب کبھی مسلمان بیدار ہو فوراً اس سے کہہ دیا جائے کہ اگر حکومت اس قابل نہ ہوتی تو رسولؐ کے نواسے حسینؑ کیوں بیعت کرتے؟ یہ یزید کی نادانی تھی کہ اس نے یہ تصور بھی کیا کہ حسینؑ بیعت کرلیں گے۔ حسینؑ اگر بیعت کرلیتے تو قیامت تک حقائق پر پردہ پڑ جاتا۔ اسی لئے ان کو بیعت سے انکار ضرور تھا۔ اسی طرح حسینؑ نے دو نتیجے حاصل کئے: ایک مسلمانوں کے لئے ایک دوسرے کے لئے مسلمانوں کے لئے۔ آپ نے یہ اصول اپنے خون کی سرخ روشنائی سے ثبت کردیا۔ کہ قانون شریعت خلیفۂ وقت کے عمل کا پابند نہیں ہے۔ اس لئے کبھی خلفائے وقت کے عمل سے احکام شرع کے سمجھنے کی کوشش نہ کرنا اور دوسرے فرقوں کے لئے یہ کہ اگر تمہیں اسلامی تمدن اسلامی تعلیم اور اسلامی اخلاق کا مطالعہ کرنا ہو تو کسی دمشق یا قرطبہ کے قصر خضراء یا قصر حمراء میں نہ جانا بلکہ مدینہ کے ان ٹوٹے ہوئے کھنڈروں پر نظر ڈالنا جہاں بوسیدہ پردے اور کچی دیواریں نظر آتی ہیں۔ اس طرح حسینؑ نے قیامت تک یزید اور یزید منش انسانوں کو ان کے اصلی رنگ روپ میں دنیا کے سامنے پیش کردیا اور غلط فہمی کے امکانات کو ختم کردیا۔

حسینؑ کا یہ جہاد جو اپنی قوم ہی کے مقابلہ میں تھا اپنی نوعیت کے اعتبار سے جداگانہ تھا وہ اسلامی جہاد جو غیروں کے مقابلہ میں ہو اس میں کچھ پابندیاں عائد ہوتی ہیں۔ مثلاً جہاد اسی وقت کیا جائے گا جب غلبہ کا امکان ہو، تعداد کافی ہو، پھر سپاہیوں کی عمر کے لحاظ کی بھی ایک مقدار مقرر ہے کہ اس سے زیادہ عمر نہ ہو۔ اسی طرح اور بھی پابندیاں ہیں، مثلاً حسینؑ نے جو جہاد کیا وہ اس جہاد سے بالکل مختلف تھا۔ قرآن میں حکم آیا ہے کہ ۲۰ مسلمان ۲۰۰ کا مقابلہ کریں لیکن جب یہ معیار عمل کی کسوٹی پر پورا نہ اتر سکا تو کہا گیا کہ اچھا سو (۱۰۰) اور دوسو (۲۰۰) کی نسبت سے مقابلہ کرو۔ وہ پہلا ہی معیار جو قرآن نے قائم کیا تھا جو عمل کی کمزوری کی بنا پر قابل قبول ثابت نہ ہوز یادہ سے زیادہ بیس اور دوسو یعنی دس گنے کی نسبت سے تھا، لیکن کربلا میں جو جہاد کیا گیا تھا اس میں ادھر بہتر (۷۲) دوسری طرف کم ازکم تیس ہزار فوج۔ اس میں جو نسبت کا فرق ہے وہ بدرجہا زیادہ ہے۔ پھر جہاد میں تعداد کافی ہونا ضروری چیز ہے مگر کربلا کی جنگ میں تعداد کے بڑھانے کے بجائے گھٹانے کی کوشش ہوئی۔ راستے میں جتنے لوگ کچھ امیدوں کی بناء پر ساتھ ہو لئے تھے آپ نے شہادت مسلمؑ کی خبر سننے کے بعد ان سے کہا کہ میں کسی فوج کشی یا حکومت کی باگ اپنے ہاتھ میں لینے کی غرض سے نہیں جارہا ہوں۔ وہ واپس جائیں اور اس طرح بہت سے لوگ چلے گئے۔ اس کے بعد کربلا میں بھی شب عاشور آپ نے اپنے ساتھ کے لوگوں سے فرمایا کہ تم میں سے جو جانا چاہے بخوشی چلا جائے۔

پھر عمر کی پابندیاں جہاد میں لازمی ہوتی ہیں۔ یہاں وہ بھی باقی نہیں رہیں ۸۰ برس کے حبیب ابن مظاہرؑ بھی ساتھ میں ہیں اور نابالغ بچے بھی۔ بلکہ چھ ماہ کا شیر خوار علی اصغرؑ بھی میدان جہاد میں ساتھ ہے۔

معلوم ہوا کہ غیروں کے ساتھ جہاد میں جو شرائط ضروری ہوا کرتے ہیں، دین خدا کی حفاظت کے لئے اپنوں کے ساتھ جہاد کرنے میں ان کا کبھی لحاظ نہیں کیا گیا۔ بلکہ تمام شدید ترین مصائب کو اس سلسلہ میں برداشت کیا گیا۔ امام حسینؑ نے دنیا کو مشترکہ انسانی حقوق کی جو تعلیم دی ہے وہ موجودہ زمانہ میں بھولی ہوئی انسانیت کی یاد دلانے کے لئے کافی ہے۔ پانی رسد کا اہم ترین جزو ہونے کی حیثیت سے خود حسینؑ کے لشکر کے لئے ضروری اور بیش قیمت تھا اور دشمن کو پانی پلا کر تقویت پہنچانا بظاہر اپنے کو کمزور کرنے کے مترادف تھا۔ لیکن امام حسینؑ نے فوج حر کو پانی پلا کر ظاہر کیا کہ اگر چہ دشمن ہیں مگر نوع بشر کی فرد ہیں اور پیاسے ہیں۔ لہٰذا پانی ان سے عزیز نہیں کیا جاسکتا۔ یہ نہیں کہ محض حکم دے دیا ہو جیسا کہ اکثر لیڈر کرتے ہیں کہ زبانی تعلیم دے دیتے ہیں اور اس پر عمل درآمد نہ کیا گیا تو یہ عذر پیش کر دیتے ہیں کہ ہم نے تو کہہ دیا تھا۔ جماعت نے ہمارا حکم نہ مانا بلکہ اس حقیقی رہنما کی شان یہ تھی کہ خود کرسی بچھا کر اپنے سامنے پانی پلوانے لگے۔ بخدا امام حسینؑ کے انصار وہی کرتے جیسا حسینؑ نے حکم دیا تھا لیکن امام حسینؑ نے خود اپنا فرض بھی ادا کرنا ضروری سمجھا۔

علی ابن طعان محاربی کا بیان ہے کہ میں بہت پیاسا تھا، حسینؑ نے محسوس کر لیا اور کہا: 'اے شخص فلاں اونٹ پر پانی ہے، پی لے، میں گیا لیکن فرط تشنگی سے دہانہ ٹھیک منھ تک نہ لگا سکا اور پانی گرنے لگا حسینؑ بہ نفس نفیس اٹھ کھڑے ہوئے اور خود مشک کا دہانہ ٹھیک کر کے مجھے سیراب فرمایا۔'

یہ اور اس کے مثل وہ حسینی تعلیم کے خط وخال ہیں جن کی وجہ سے ہم یہ کہنے کی جرأت کرتے ہیں کہ حسینؑ کی ذات تمام فرقہ بندیوں سے بالاتر ہے۔

✿✿✿

شہید کربلاؑ کے خاندانی خصوصیات اور فداکارانہ روایات

یہ مقالہ سب سے پہلے ماہنامہ 'الواعظ' لکھنؤ محرم نمبر ۱۹۴۱ء میں شائع ہوا تھا، اس کے بعد 'پیام اسلام' لکھنؤ محرم نمبر ۱۹۵۷ء میں، پھر امامیہ مشن لکھنؤ کے سلسلہ نمبر ۳۷۴ کے عنوان سے علیحدہ رسالہ کی صورت میں (محرم ۱۳۸۳ھ/ ۱۹۶۳ء) اشاعت پذیر ہوا۔

یہ سلسلہ شروع ہوتا ہے حضرت ابراہیم خلیلؑ سے۔ یہ بین الاقوامی حیثیت رکھتے ہیں یعنی یہود و نصاریٰ اور مسلمان سب ان کو تسلیم کرتے ہیں۔ اس لئے حضرت سید الشہداءؑ کے نسبی خصوصیات کو آپ کے تعارف کے لئے یہیں سے شروع کرنا مناسب ہے اور پھر واقعات قربانی کا سلسلہ بھی یہیں سے شروع ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ حضرت ابراہیمؑ کی ذات کو اسلام کا مورث اعلیٰ بھی سمجھنا چاہئے کیونکہ آپ ہی نے اس جماعت کا جو راہِ حق میں ان کے پیچھے آئی سب سے پہلے 'مسلم' نام رکھا۔ قرآن مجید میں اس کی تصریح موجود ہی ہے "هُوَ سَمَّاكُمُ الْمُسْلِمِينَ مِنْ قَبْلُ" اور ان کی دعا بھی بارگاہِ الٰہی میں مذکور ہے "رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا أُمَّةً مُسْلِمَةً لَكَ"۔

حضرت ابراہیمؑ کے دو بیٹے تھے اسحاقؑ اور اسمٰعیلؑ۔ اسحاقؑ یہ سلسلۂ انبیائے بنی اسرائیل کے مورث اعلیٰ ہیں اور اسمٰعیلؑ ہمارے رسول محمد مصطفیٰؐ کے دادا ہیں۔ یہیں سے ہمارے رسولؐ کا خاندان شرافت دوسرے سلسلہ سے الگ ہوا۔ آپ کو معلوم ہے کہ کچھ خاص خاص داخلی اسباب کے ماتحت حضرت ابراہیمؑ نے اپنے فرزند اسمٰعیلؑ کو شیر خوارگی کے عالم میں ان کی ماں ہاجرہ کے ساتھ مکہ کی سرزمین پر پہنچا دیا۔ یہ وہی جگہ ہے جہاں خانۂ کعبہ ہے۔ اس خانۂ کعبہ کی تعمیر ان ہی باپ بیٹے ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ نے کی۔

خانۂ کعبہ بن کر تیار ہوا اور تمام اطراف ملک کے لوگوں کا نقطۂ اجتماع بن گیا۔ یہاں مرکزیت شروع ہوئی آل ابراہیمؑ ہی

خانۂ کعبہ کے بانی، یہی خانۂ کعبہ کے محافظ، اور کعبہ کیا؟ تمام قبائل عرب کا مرکز۔

قدرت نے ان باپ بیٹے کا امتحان لینا چاہا۔ باپ مامور ہوگیا کہ بیٹے کو اپنے ہاتھ سے ذبح کرے۔ یہی وہ ہے جس کی یادگار عید قرباں میں آج تک قائم کی جاتی ہے۔

گویا اس سلسلۂ شرافت کا آغاز ہی نفس کی قربانی سے ہوا، آگے بڑھئے، سلسلہ پہنچا نضر بن کنانہ تک، ان کی اولاد قریش کہلائی۔ جس طرح تمام دنیا میں آل ابراہیمؑ کو خاص امتیازات حاصل ہوئے۔ آل ابراہیمؑ میں اولاد اسمٰعیلؑ خاص خصوصیات کی حامل ہوئی۔ اب اولاد اسمٰعیلؑ میں قبیلۂ قریش کو امتیازی خصوصیات حاصل ہوئے۔ خانہ کعبہ کی ذمہ داری اس کی حفاظت سقایت اور تولیت سب قریش سے مخصوص تھیں، تمام عرب ان کی عزت کرتے تھے۔

قریش میں ہاشم پیدا ہوئے جو تمام خصوصیات کے حامل بنے۔ یہاں سے بنی امیہ کی شاخ الگ تھی ان کے مورث اعلیٰ نے ہاشم سے منازعت کی مگر شکست کھائی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ خانۂ کعبہ کے حقوق تولیت، سقایت اور تمام انتظامات ہاشم کے پاس رہے اور بنی امیہ اس سے محروم ہوگئے۔ اس طرح آل ہاشم کا امتیاز آل امیہ کے مقابلہ میں تسلیم ہوگیا۔

ہاشم کے فرزند عبدالمطلب بڑی بلند شخصیت رکھتے تھے۔ 'سید البطحا' ان کا خطاب ہوا اور یہی لقب ہے جو ان کی اولاد میں رہ گیا جس سے آج تک آل رسولؐ سادات کہلاتے ہیں۔ ان کا اعتماد توکل اور خدا پر بھروسہ اس وقت پورے طور پر ظاہر ہوا جب ابرہہ نے یمن سے آکر کعبہ پر حملہ کیا۔ یہ اصحاب فیل کا مشہور واقعہ ہے۔ اس وقت عبدالمطلب بارگاہِ الٰہی میں دست دعا بلند کئے ہوئے تھے۔ نتیجہ معلوم ہے کہ خدائی لشکر نے اصحابِ فیل کو برباد کر دیا۔ یہ تھے عبدالمطلب جو محافظ حرم بھی تھے اور حافظ حرم بھی ثابت ہوئے۔ عبدالمطلب کے کئی بیٹے تھے جن میں سے دو عبداللہ اور ابوطالب تھے، عبداللہ نے اسمٰعیل کا درجہ حاصل کر کے ذبیح کا لقب لیا یعنی ان کو بھی عبدالمطلب نے رضائے الٰہی کے لئے قربانی کے محل پر پیش کیا تھا اور وہ بھی فدیہ پا کر ذبح سے محفوظ ہوئے مگر ان کا انتقال باپ کے سامنے ہوگیا، اس لئے عبدالمطلب کے تمام امتیازات ابوطالب کو حاصل ہوئے۔ ابوطالب شیخ البطحا اور سردار قریش مشہور ہوئے۔ دیکھئے وہ خصوصیات جو بکھرے ہوئے تھے کس طرح سمٹے آتے ہیں ایک نقطہ پر۔ ابوطالبؑ حامل ہوئے تمام مواریث انبیاء تمام امانتوں کے جو ابراہیمؑ کی چھوڑی ہوئی تھیں جو اسمٰعیلؑ کی متروکہ تھیں، اور سب سے بڑی امانت وہ رسولؐ کی ذات تھی، اور اس طرح جتنی امانتیں رسولؐ کی ذات سے متعلق سمجھی جاسکتی ہیں ان سب کی حفاظت قدرت کی جانب سے ابوطالبؑ کے متعلق ہوئیں تاریخیں بتلاتی ہیں کہ ابوطالبؑ نے کس شان سے امانت داری کے فرض کو انجام دیا۔

اب آپ دیکھیں کہ یہ زمین شرف کس آسمان پر پہنچتی ہے آل ابراہیمؑ، آل اسمٰعیلؑ، نسل قریش، آل ہاشم کی جتنی عزتیں تھیں وہ ایک مرکز پر طواف کر رہی ہیں۔ ابوطالبؑ نے حضرت محمد مصطفیٰؐ کی پرورش میں جان کو جان نہ سمجھا۔ انھوں نے اپنی اولاد کو رسولؐ پر جاں نثاری کی مشق کرائی۔

اس وقت جب یہ لوگ شعب ابوطالبؑ میں محصور تھے تو اس خیال سے کہ کہیں دشمن شب کو اچانک حملہ کر کے حضرت محمد مصطفیٰؐ کو قتل نہ کردے، ابوطالبؑ آپ کو ایک بستر پر رہنے نہ دیتے تھے بلکہ اپنی اولاد کو باری باری آپ کے بستر پر لٹاتے تھے اور آپ کو ان کے بستر پر منتقل کر دیتے تھے۔

اس کا مطلب یہ تھا کہ محمدؐ کے بدلے جو بھی میرا فرزند قتل ہوجائے، کوئی پرواہ نہیں، مگر رسولؐ کی جان بچ جائے۔ اس ذوق قربانی کو بھی یاد رکھئے گا۔ یہ بھی کس کی خاطر ہے؟ چاہے کہئے محمدؐ کی خاطر اور چاہے کہئے اسلام کی خاطر۔

ابوطالبؑ کی آغوش میں حضرت محمد مصطفیٰؐ کی جب تربیت ہو رہی تھی، ابھی آپ کی عمر نوجوانی ہی کی منزل میں تھی کہ آپ کی سچائی اور امانت داری کو تمام عربوں نے تسلیم کرلیا اور آپ کو

صادق اور امین کا لقب دیا۔ یہاں تک کہ اپنی امانتیں آپ کے پاس رکھوانا شروع کیں۔ اس کے علاوہ اہم معاملات میں آپ کے تصفیہ کو قابل قبول سمجھا۔ خانۂ کعبہ کی مرمت کے موقع پر حجر اسود کے رکھے جانے کا قصہ مشہور ہے۔

محمد مصطفیؐ کی عمر ۳۰ برس کی تھی، اس وقت ابوطالبؑ کے یہاں وہ فرزند پیدا ہوا جس کا نام تھا علیؑ۔ ابھی علیؑ چار پانچ برس کے ہوں گے کہ مکہ میں قحط پڑا اور ابوطالبؑ اقتصادی تکالیف میں مبتلا ہوگئے آپ کے بار کو کم کرنے کے لئے محمد مصطفیؐ نے علیؑ کی پرورش اپنے متعلق کرلی۔ اب علیؑ محمدؐ کے آغوش تربیت میں تھے۔ وہ دس برس کے تھے جب حضرت محمد مصطفیؐ اس پیغام کے پہنچانے پر مامور ہوئے جس کا نام ہے اسلام۔ یہ پوچھنا صورت واقعہ کے لحاظ سے اصول فطرت کے خلاف ہے، کہ علیؑ نے اس پیغام کو کب قبول کیا؟ وہ تو رسولؐ کے ہر وقت ساتھ تھے اور آپ ہی کی تربیت میں تھے، اس لئے ہر ہر وقت جو رسول کا راستہ تھا وہ علیؑ کا تھا۔

عمر کے لحاظ سے ابھی علیؑ بچہ ہی تھے اور تربیت سے بے نیاز نہیں تھے، اس لئے مجھے کہنے دیجئے کہ اب رسولؐ کی آغوش میں دو چیزیں پرورش پارہی تھیں، ایک اسلام اور دوسرے علیؑ۔ علیؑ اور اسلام میں وہی وابستگی تھی جو ایک آغوش میں رہنے والے دو بچوں میں آپس میں ہوتی ہے۔

رسولؐ کو اپنے پیغام کی اشاعت میں بڑی تکلیفیں دی گئیں۔ کوڑا کرکٹ سر پر پھینکا گیا۔ پتھروں سے جسم مجروح کیا گیا، اس سب کو آپ نے گوارا کیا، کاہے کے لئے اسلام کی خاطر۔ آخر میں سب آپ کے قتل پر آمادہ ہوگئے اور ایکا ہوگیا کہ رات کے وقت آپ کو قتل کر ڈالیں گے۔

رسولؐ نے طے کرلیا کہ وہ اپنے مقاصد کی حفاظت کے لئے مکہ معظّمہ کی سرزمین کو چھوڑ دیں اور مخفی طور سے رات کے وقت نکل کر مدینہ چلے جائیں، اسی کا نام ہے ہجرت۔

اس موقع پر آپ نے اپنے چچا زاد بھائی علیؑ ابن ابی طالبؑ کو مقرر کیا کہ وہ آپ کے بستر پر آپ کی چادر اوڑھ کر سو رہیں۔ علیؑ بستر رسولؐ پر سو رہے۔ یہ کوئی معمولی واقعہ نہیں۔ کھنچی ہوئی تلواریں دشمنوں کی ارد گرد موجود تھیں۔ سب قتل ہی کے ارادہ سے آئے تھے۔ یہ تو اتفاق کی بات ہے اور قدرت کا انتظام ہے کہ علیؑ کی جان بچ گئی ورنہ سامان قتل کا مکمل تھا، اور علیؑ اپنی جان دے چکے تھے یہ کس کی خاطر ہوا؟ صرف اسلام کی خاطر۔

رسولؐ کی ایک بیٹی تھیں فاطمہ زہراؑ جنھیں آپ بہت عزیز رکھتے تھے۔ ہجرت کے دوسرے سال آپ نے اپنی اس بیٹی کا عقد علیؑ بن ابی طالبؑ کے ساتھ کردیا۔

اب آپ جانتے ہیں فاطمہؑ کون ہیں؟ دختر داعی اسلامؐ، دختر پیغمبر اسلامؐ اور علیؑ کون ہیں؟ محافظ اسلام، مجاہد اسلام بلکہ فدیۂ اسلام۔ ان ہی دونوں علیؑ اور فاطمہؑ کے فرزند تھے حسینؑ۔ اب کیا حسینؑ بھلا سکتے تھے اپنے خاندانی خصوصیات اور قدیم روایات کو؟

حسینؑ نے دیکھا نہیں مگر کانوں سے تو سنتے رہے، کہ ہمارے مورث اعلیٰ ابراہیمؑ خدا کی رضا کے لئے بیٹے کے ذبح پر تیار ہوگئے، ہمارے پر دادا عبدالمطلبؑ نے اپنے بیٹے عبداللہ کو قربانگاہ عبودیت میں پیش کیا۔ حسینؑ نے سنا کہ پیغمبر اسلام کے سینہ سپر رہے میرے دادا ابوطالبؑ، پھر اسی اسلام کے لئے پتھر کھائے میرے نانا رسولؐ اللہ نے۔ حسینؑ نے سنا کہ جب اسلام کی حفاظت کا مسئلہ پیش تھا تو تلواروں کے حصار میں بستر پر کون لیٹا تھا؟ میرے باپ علیؑ بن ابی طالبؑ، پھر ہر سخت موقع پر اسلام کے لئے جہاد کس نے کیا؟ علیؑ بن ابی طالبؑ نے کیا۔ ان تمام واقعات اور قدیم روایات کے ہوتے ہوئے حسینؑ یہ نہ سوچتے کہ اب اسلام پر وقت پڑا ہے تو مجھے کیا کرنا چاہئے؟

بچّے جب اپنے بزرگوں کے حالات سنتے ہیں، تو ان میں بچپن ہی سے ولولہ پیدا ہوجاتا ہے کہ ہم بھی ایسا ہی کر کے دکھائیں۔ حسینؑ بچپن سے ولولہ رکھتے تھے۔ منتظر تھے اور مشتاق تھے کہ اسلام کی خدمت کا کوئی موقع آئے تو میں بھی اسے کر کے

بقیہ۔۔۔۔۔صفحہ ۱۲/ پر

بنیادی فرض تھا اور اس کو پہچاننا اُس کے لئے ضروری تھا اس لئے اسلام نے پہلی تعلیم اسے یہی دی کہ وہ اپنی پیشانی اگر کسی کے سامنے جھکائے تو وہ صرف اللہ کی ذات ہونا چاہئے۔قرآن پاک کا اس سلسلہ میں یہ ارشاد ہے، جس کا ترجمہ یہ ہے:

''(اے لوگو!) وہی تمہارا پروردگار ہے اس کے سوا کوئی اور معبود نہیں وہی ہر چیز کا پیدا کرنے والا ہے۔تو اسی کی عبادت کرو۔'' (سورہ انعام، ۱۰۲)

دین اسلام کی سب سے زیادہ اہم، گہری اور بنیادی تعلیم خالق عالم کا اعتقاد ہے جسے کسی دوسرے دین نے صحیح طور پر انسان کے سامنے کبھی نہیں پیش کیا سوائے اسلام کے جس نے تصوّرِ الٰہ کو اس کی پوری عظمت و برتری کے ساتھ ظاہر کیا ہے کیونکہ اسی اعتقاد اور اسی نظریہ پر انسان کے اصلاحی نظام اور اس کے صحیح کردار کی تخلیق ممکن اور موقوف تھی یہ انسانی فطرت کا سچا تقاضا تھا کہ وہ اپنی برتری کو سمجھے اور اپنے خالق اور پروردگار کی عظمت کا عقیدہ اختیار کرے۔اسلام نے اُس کو فطرت کے اس تقاضے سے آگاہ کیا اس کے بعد اسلام کی جس قدر بھی تعلیمیں ملتی ہیں اُن میں فطرتِ انسانی کے تقاضوں کا پورا لحاظ موجود ہے اور یہ وہ خصوصیت ہے جو دنیا کے کسی مذہب میں نہیں پائی جاتی۔

اسلام کی بنیادی تعلیموں میں دوسری چیز نبوت و رسالت ہے جو انسان کی فطرت کا دوسرا تقاضا تھا۔جب اس نے اللہ کو مان لیا اور اس بات کو تسلیم کر چکا کہ اُس کا کوئی پیدا کرنے والا موجود ہے اور اُس کی پیدائش کسی خاص غرض اور مقصد کے لئے ہوئی ہے تو پھر اُس کی فطرت کا تقاضا تھا کہ وہ اسے بھی جان لے کہ اللہ کی کیا مشیّت ہے اور وہ اپنی مخلوق سے کیا چاہتا ہے۔اسی راز کو بتانے کے لئے ایسی بزرگ و برتر ہستیوں کی ضرورت تھی جو اپنے عمل اور اپنے کردار کے لحاظ سے اس منصب کی مستحق ہوں کہ وہ اللہ کا پیغام اُس کے بندوں تک پہنچا سکیں اور خلق خدا کو اُس کے فرائض سے آگاہ کریں۔ایسے ہی لوگ نبی اور رسولؐ کہے جاتے ہیں۔اس نبوت کے عقیدہ کو اسلام نے دوسرا درجہ عطا کیا ہے، جو فطرتِ انسانی کا وجود خدا اور توحید کے بعد سب سے بڑا فطری تقاضا تھا کیونکہ اس کے بغیر انسان کا نظامِ زندگی مکمل ہی نہیں ہوسکتا تھا۔اسلام نے انسان کو انسانی برادری کی قدر بتائی، معاشرتی زندگی کے اصول سمجھائے، اجتماعی روابط سے آشنا کیا اور زندگی کے ہر شعبہ اور حیات کے ہر گوشہ کے لئے اُس کو ہدایات دیں۔ ✡✡✡

بقیہ۔۔۔۔شہید کربلا کے خاندانی خصوصیات

دکھاؤں۔آیا وقت اور ۶۱ھ میں حسینؑ کو اس اسلام کی خاطر وہ سب کچھ نذر کر دینا پڑا، جو ان کے پاس سرمایہ تھا۔

انھوں نے اتنی بڑی قربانی پیش کر دی جس کی نظیر نہ اس کے پہلے نظر آتی ہے، نہ اس کے بعد۔آج جبکہ اس واقعہ کو تیرہ سو سال پورے ہو رہے ہیں وہ اسی طرح ندرت اور عظمت رکھتا ہے جس طرح اپنے وقوع کے موقع پر رکھتا تھا۔اور اسی لئے آج تک دنیا اسے یاد رکھتی ہے اور اس وقت تیار ہو رہی ہے کہ اس کی سیزدہ صد سالہ یادگار بڑے وسیع پیمانہ پر قائم کی جائے۔

آج جبکہ اسلام کو بڑی ضرورت قربانی کی ہے، اس یادگار کا قائم کرنا مسلمانون کے لئے حیات بخش ہے۔دیکھنا ہے مسلمان اپنے اس فرض کو کس طرح انجام دیتے ہیں۔ ✡✡✡

بقیہ۔۔۔۔اصلاح سخن

نہیں ہوئی۔ملاحظہ ہو:

دل مجھ سے کہہ رہا ہے بگڑی ہوئی ضدوں پر
قربان سو ادائیں ظالم کی اک نہیں پر

(باقی آئندہ انشاءاللہ)

نوٹ: استاد بھائیوں سے التماس ہے کہ وہ اپنی ایک ایک غزل مع استاد معظم کی اصلاح کے میرے پاس بہت جلد روانہ فرمادیں تاکہ میں آیندہ ''اصلاح سخن'' کے ذیل میں پیش کرسکوں۔ (بہزادؔ)

(ماخوذ از ماہنامہ 'نظارہ' لکھنؤ، مشاعرہ نمبر ۱۹۳۲ء)